

باسمہ تعالیٰ

سرحدی زیرما فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمران ہے اک وہی 'باقی بتان آوری

آزادی کا قرآنی مفہوم

.....

یوم آزادی۔ اگست ۱۹۴۹ء پر خطاب

پرویز

آزادی کا قرآنی مفہوم

غیر منقسم ہندوستان میں 'کانگریس' (یعنی ہندو) بانیار (تحریک پاکستان کے سربراہ) قائد اعظم سے کہتے تھے کہ جب ہمارا مقصد بھی حصول آزادی ہے اور آپ کا مقصد بھی وہی تو آپ کو ایک الگ تنظیم قائم کرنے اور جدا گانہ تحریک چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ ہم دونوں مل کر، انگریز کمربیاں سے نکال کر آزادی حاصل کر لیں گے اور نظام جمہوریت کی رو سے عوام کی حکومت قائم کریں گے جس میں تمام باشندگان ملک کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ اس کے جواب میں دہلی کے علامہ اقبال اور ان کے بعد قائم اعظم ان سے کہتے تھے کہ لفظ 'ملک' پر تو آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جہاں تک لفظ آزادی کے مفہوم کا تعلق ہے، وہ آپ کے اور ہمارے نزدیک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انگریز بیاں سے چلا جائے اور اہل ہند اپنی حکومت آپ قائم کر لیں۔ لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم مقصود اس سے مختلف ہے، اور وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت قائم نہ ہو جائے۔ (بالفاظ دیگر) وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارے نزدیک آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات ہے اور ہمارے نزدیک آزاد مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جو مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے۔

یہ تھا تحریک پاکستان کے دوران کانگریس اور مسلم لیگ۔ یا ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش کا لفظ تصادم مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی وضاحت کے لئے وہاں طلوع اسلام کا وجود عمل میں آیا۔ اس نے اس فریضہ کو کس جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ ادا کیا، اس پر اس کے اُس زمانے کے فائل شاہد ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد (نظر بظاہر) اس کشمکش کو ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن یہ فطرت کی ستم گردی یا عوامی انتہائی بد نصیبی تھی کہ یہاں پہنچنے کے بعد یہ کشمکش اور بھی شدت اختیار کر گئی۔ یعنی یہاں آزادی سے وہی مفہوم لے لیا گیا جسے تحریک پاکستان کے دوران ہندو پیش کر رہے تھے۔ یعنی مسلمانوں کی آزاد مملکت میں جمہوری نظام کا قیام، فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں آئین کے برعکس خدا اور اسلام کے الفاظ چسپاں کر دیئے گئے، اسی طرح جس طرح ہم اپنے خطوط کی پیشانی پر بسم اللہ یا (۱۶) لکھ دیتے ہیں خواہ اس کے نیچے خط میں شراب کی دوا نہ لکھی ہو یا کھانسی کی دوا نہ درج ہو۔

پنڈا یہاں بھی طلوع اسلام نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا کہ وہ بتائے کہ آزادی کا وہ مفہوم کیا تھا جس کے لئے اس خطہ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے پروفیسر صاحب گزشتہ تیس سال سے مسلسل مصروف جہاد ہیں۔ یوں تو طلوع اسلام کی کون سی اشاعت ہے جس میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اس موضوع پر کچھ نہ کچھ نہ لکھا جانا چاہیے، لیکن خاص تقاریر بالخصوص یوم آزادی (۱۴ اگست) کی تقریر پیرس میں پروفیسر کے خصوصی مقالات یا خطابات اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ ۱۹۹۷ء کے یوم آزادی کی تقریر کے سلسلہ میں جب ہم نے گزشتہ تقاریر کے خطابات پر ایک نظر ڈالی تو ہم نے دیکھا کہ انہوں نے ۱۹۹۷ء میں جو خطاب ارزانی فرمایا تھا (اور جس کا عنوان تھا — کیا ہم آزاد ہیں؟) وہ نہ صرف بڑا جامع اور نافع تھا بلکہ ایسا کہ وہ ملک کے موجودہ حالات میں بھی شیعہ قرآنی کام دے سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے کتاب سمجھا ہے کہ اس تقریر پر ان کی نظر ثانی کے بعد اسی کو زیب دہ اور اوراق طلوع اسلام کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ پروفیسر صاحب اپنے خطابات یا مقالات میں جو قرآنی خالق پیش کرتے ہیں وہ کبھی پرانے یا (out of date) نہیں ہوتے۔ البتہ ان کی تشریحات اور جزئیات، حالات کے بدلنے سے محتاج تغیر و تبدل ہو جاتی ہیں۔ یہی ان کی نظر ثانی سے مقصود ہوتا ہے۔

اس تہذیب کے بعد ان کا خطاب ملاحظہ فرمائیے۔



عسکری زبان گامی قدر۔ سلام و رحمت
 اگست ۱۹۹۷ء میں جب ہم نے اپنی آزادی کی پہلی سالگرہ منائی تو اس موضوع پر جو کچھ طلوع اسلام میں لکھا گیا تھا وہ آج بھی ہر سو پہنچنے والے ذہن کو اسی طرح دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ انسان تاریخ کے اوراق پیچھے کواٹھے جائیے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات بھونپڑیوں اور بھونپڑیوں سے غاروں تک کے از مد مسئلہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلنے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے۔ ہر زور و ماندہ بدلے گا۔ اسلوب و رفتار و گفتار بدلے گا لیکن عصارہ و دھور کے اس تعداد و تباہی اور اھوا و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی جدوجہد میں رہا ہوتی رہی ہے۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوچھا ہے۔ لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور ملاخصیص زمان و مکان ہمیشہ غور و فکر کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی دور میں، یا اگر وہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان جھٹلت ادوار میں نماز پر و فراغت زمان اور اکاسرہ و قیامہ دہر ہمیشہ اس کو کشش میں رہے کہ کروڑوں اور ناؤں انسانوں کے سینے سے آزادی کی تتا کو مٹا دیا جائے لیکن کروڑوں ناؤں انسانوں نے

اپنا سب کچھ لٹا اور مٹا گواہ کر لیا مگر آزادی کی حسین آمد و رفت کو اپنے دل کے کٹانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاع حیات تک کی بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حریف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگ سال پران گنت مروجیں آئیں اور غفلت نقوشیں کر رہا کر اپنے سانحہ لے گئیں لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ و تانہ کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطل جلیل کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی۔ یا پھر اس تنگ انسانیت کا نام حمد ہے جنہوں نے انہوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں سے لے لیا۔ بہر حال، دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے پاپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے۔ یہی نکتہ کہ آزادی کا تقاضا دنیا کے ہر وقت میں شرف و مجد انسانیت کے مرادوں اور غلامی، ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کیا یہ امر باعث تعجب و موجب ہزار حیرت نہیں کہ آزادی کی خاطر سب کچھ کر دینے والا انسان آج تک یہ بھی متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کتنے کسے ہیں؟ عوام کو تو چھوٹا سا اس باب میں خواص تک کی یہ کیفیت ہے کہ وہ آزادی کی کوئی متعین (DEFINITION) بھی نہیں دے سکے۔ میرے سامنے اس وقت پولیٹیکل سائنس کی ایک کتاب ہے جو نہایت مختصر ہونے کے باوجود خاصی شہرت کی حامل ہے۔ یعنی (SOCIAL JUSTICE) یہ عصر حاضر کے ممتاز علمائے سیاست کے چیدہ چیدہ مقالات پر مشتمل ہے جنہیں پروفیسر (RICHARD B. BRANDT) نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس کے ایک مقالہ میں ڈاکٹر، پینسر، کانٹ، مل، ہارٹ، رولز، پاپر، مارکس، انجلز، جیسے ممتاز مفکرین کی طرف سے پیش کردہ آزادی کی (DEFINITIONS) درج کی گئی ہیں اور اس کے بعد دلائل و شواہد بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی فیضی نشی بھی جامع اور واضح نہیں۔ ان تمام نگرانی اختلافات کے باوجود ایک بات البتہ ہر جگہ اور ہر مقام میں بطور تکرار مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی قوم پر کوئی دوسری قوم حکمران ہو تو اسے غلامی کہا جاتا ہے اور اپنی حکومت کو آزادی۔ چنانچہ ہندوستان میں تحریک آزادی سے بھی یہی مفہوم لیا گیا تھا۔ وہ تحریک سامراج (یعنی غیروں کی حکومت) کے مقابلہ میں سواراج (اپنی حکومت) کے لئے جدوجہد تھی۔

مٹنا (جہاں) گاتھی نے مسلمانوں میں نئے اصطلاح — حکومت خداوندی — کے مقابلہ میں ملام و احمدی کی اصطلاح وضع کی تھی لیکن وہ چل نہیں سکی تھی۔ دین آزادی کے لئے سواراج ہی کی اصطلاح رائج رہی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ایک ہندوستان کی تحریک آزادی قائم کی جائے۔ یہی تحریک آزادی کا منہ بولی و مقصود تھا۔ اس جدوجہد

میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کے بڑے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہ نما، مثل مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ شامل تھے اور اس جدوجہد کو جہاد قرار دیتے تھے۔ یہ جدوجہد ایسی تھی جس کے مقصد و منہ بولی دینی غیروں کی جگہ اپنی قوم کی حکومت کے قیام کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں دو آراء ہونے لگتے ہیں کہ جب یہ جدوجہد پورے زوروں پر تھی تو اس کے خلاف ایک اور زبردستی جس نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ آزادی کا یہ مفہوم ہندوؤں کے نزدیک صحیح ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا یہ مفہوم و مقصود درست قرار نہیں پاسکتا۔ ان کے نزدیک اگر وہ اسلام آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ تحریک آزادی کے علمبرداروں نے اس آواز کی سخت

مخالفت کی اور اس میں چونکہ یہ کہا گیا تھا کہ اسلام کی رو سے آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے اس لئے اس آواز کی مخالفت میں علامہ حضرت بڑی شہید سے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشہور یہ کیا کہ یہ آواز انگریزوں کے وضع کردہ ناقوس کی صدا کے بازگشت ہے اور متعدد اس سے آزادی کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹھانا۔ اس آواز کے بلند کرنے والے نے کہا کہ یہ الزام سراسر کذب ہے، اعتراض ہے۔ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا تعلق ہے مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ لیکن جہاں انگریزوں کا یہاں سے نکل جانا، ہندوؤں کے نزدیک مقصود و منشی ہے مسلمانوں کے نزدیک یہ اس جدوجہد کا منتہی نہیں قرار پا سکتا۔ یہ ان کے پیش نظر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ یا سنگ میل قرار پا سکتا ہے۔ یہ آواز تھی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی جنہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اپنے مفہیم کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی کہ :-

علامہ اقبالؒ کی آواز

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔

لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے

اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی

بنیادیں اپنی اصولوں پر چوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم

کرنا چاہئے۔ اور ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلینٹ نہیں تو ایک بڑی حد تک دلا اسلام بن

جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے،

تو مسلمان ایسی آزادی وطن پرستار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا بولنا، دہرہ صرف

کرنا بلا نظایاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا۔ جسے نہ صرف

کہ اس وقت دنیا کا بہترین نظام سیاست تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ وہ عین مطابق اسلام ہے۔ اس لئے

جمہوریت

اقبالؒ کا اعتراض اس کی تہمت پرستی، تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے۔ اقبالؒ نے کہا کہ جس

نظام کو ہم بہترین نظام سمجھتے ہو، آزادی کے عام تصور کی رو سے بھی اس کی حقیقت یہ ہے کہ :-

ہے وہی ساتھ کہن مغرب کا جس جمہوری نظام جس کے یہ دلوں میں نہیں فیروز تھے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کو ب تو بھٹا ہے یہ آزادی کی ہے تسلیم پر ہی

اور جہاں تک اس کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے، سن رکھو کہ :-

حلال پادشاهی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چگنی

لہذا، اسلامی نقطہ نگاہ سے مغرب کا جمہوری نظام دیباہی مردود و مطرود ہے جیسا نظام مکیہ۔ اس نظام کے

تحت آزادی کو ہم آزادی کہہ رہے ہیں۔ لہذا، ہندو کی تحریک آزادی کے خلاف، مسلمان اسی طرح نیرو آزاد نہیں

گئے جس طرح انگریز کی غلامی کے خلاف مجاہد آ رہے ہیں۔ اس کے بعد جب تحریک آزادی کی زمام قیادت قائد اعظمؒ نے

اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی مسلسل اور متواتر اقبالؒ کی پیش کردہ حقیقت کو دہراتے رہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ

ہم ہندو اور مسلمان دونوں میں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ مسلمان اس مذہب پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطہ زندگی، اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (نقاد بر محمد علی جناح - جلد دوم - ص ۱۳۶ و ۱۳۷)

یہ تھا آزادی کے مفہوم کے متعلق ہمارا اختلاف جس کی بنا پر ہم نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف عداوت قائم کیا تھا۔ ہماری یہ عداوت آدنی اس وقت تک جاری رہی جب تک ہم نے پاکستان حاصل نہ کر لیا۔

ہم نے آزادی کے اپنے مفہوم کے لئے پاکستان حاصل کر لیا لیکن اس کے بعد دنیا نے ایک عجیب تماشہ دیکھا کہ یہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کے اس جمہوری نظام کو مانج کر لیا جسے اقبالؒ نے اسلام کے خلاف سازش قرار دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے دو باتیں کہی تھیں۔ ایک یہ کہ مغرب کا جمہوری نظام، استبداد و مملکت ہی کی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ اس میں نوع انسان کبھی آزادی سے ہلکا نہیں ہو سکتی۔ اور دوسرے یہ کہ یہ نظام، اسلام کی ضد ہے۔ اس لئے اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسر نہیں آ سکتی جو اسے اسلام عطا کرنا چاہتا ہے۔ میں آج کی نشست میں اقبالؒ کے ان جرو و مادی کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا اپنی آزاد مملکت کے حصول کے بعد مغرب کے جمہوری نظام میں ہمیں حقیقی آزادی نصیب ہو گئی ہے؟ اور دوسرے یہ کہ اس نظام کے متعلق خود مغرب کے ارباب فکر و دانش اب کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

جمہوری نظام کے اساسی اصول | مغرب کے جمہوری نظام (ڈیموکریسی) کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:-

۱۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے اس اقتدار پر کسی اور کا تسلط نہیں۔ عوام کو اقتدار مطلق حاصل ہے۔ (DEMO-CRACY) کے معنی ہی عوام کی حکومت ہیں۔

۲۔ اس نظام میں عوام اپنے حاکم آپہ ہوتے ہیں اس لئے حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں یہ تفریق ہی مٹ جاتی ہے۔

۳۔ عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔

۴۔ ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے، یعنی وہ آئین یا قوانین جنہیں وہ وضع کر دیں، حتمی آخر ہوتے ہیں جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ نمائندے اپنے فیصلوں کو جب بھی چاہیں خود بدل سکتے ہیں۔

۵۔ عوام کے یہ نمائندے دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ جو گروہ اکثریت میں ہوتا ہے وہ مسیحا و سفید کا مالک ہوتا ہے جو اقلیت میں رہ جاتا ہے اس کا مسلک اکثریت کی مخالفت کرنا اور ایسے حالات پیدا کرنا ہوتا ہے جن کی رو سے ان کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے اور اس طرح اقتدار ان سے چھین کر ان کے ہاتھ میں آجائے۔

۶۔ ہر سیرا اقتدار (اکثریتی) پارٹی جو کچھ جی میں آئے کرے۔ اسے اس مدت سے پہلے جس کے لئے عوام نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، خود عوام ہی برطرف نہیں کر سکتے بجز اس کے کہ وہ اکثریت میں نہ رہیں۔

مغرب کے ارباب فکر و نظر اس نظام کے عملی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کا یا تو وجود ہی کوئی نہیں اور یا، جو یکسر باطل ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان ارباب علم و دانش کے نتائج فکر کو سامنے لائیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب کے اس نظام کو وضع اور اختیار کن حالات میں کیا تھا۔

اتوار پر یورپ استبداد کی جگہ کے دو پالتوں میں برہی طرح پس رہی تھیں۔ یعنی ملکیت کی قربانی اور ارباب کلیسا کی تقیہ کر لیں۔ — تقیہ کر لیں کا نظریہ سینٹ ہال کا وضع کردہ ہے جس نے کہا تھا کہ

یورپ کا انقلاب

نئی حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنا یہ حق کلیسا (پادریوں) کو تفویض کر دیا ہے اب یہ خدا کے نام پر جو جی میں آئے کریں۔ جب کلیسا اور رومن شہنشاہیت میں گٹھ جوڑ ہوا تو یہی اختیار خداوندی شہنشاہوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ لیکن ان پر کٹرول کلیسا ہی کا رہا۔ نو تفرقے اپنی اصلاحی تحریک سے کلیسا کے فلاحی شیعہ کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ انجیل کے سمجھنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے نہ کہ صرف چرچ کو۔ لیکن اس سے نظام حکومت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون ہی نہیں دیا گیا۔ لہذا حکومت کا استبداد بدستور قائم رہا۔ اس صورت حالات سے تنگ آ کر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس کا نتیجہ روسو کا نظریہ حکومت تھا۔ اس

نظریہ کی مدد سے کہا گیا کہ حق اقتدار نہ بادشاہوں کو حاصل ہے نہ کلیسا کے خدائی فائدوں کو۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یورپ نظام جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آیا اگرچہ اس کا اساسی تصور مفکرین یونان نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ ملکیت اور کلیسا کے استبداد کی جگہ میں پستے والی انسانیت نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر نہایت جوش و خروش اور مسرت و اقباط سے اس کا غیر مقدم کیا اور اسے نوع انسان کے لئے آید رحمت سمجھا۔ ان تصورات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نظریہ جمہوریت (گویا کر لیں) کے سامنے آنے پر یہ جوش و مسرت، درحقیقت استبداد ملکیت اور قربانی مذہبی پیشوائیت سے حصول نجات پر تقیہ نہ رو عمل تھا۔ نظام جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہار و تشکر نہیں تھا۔ اس نظام پر تو ابھی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے عملی تجربہ کے بعد مفکرین مغرب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس میں میں اپنی کتاب ”انسان نے کیا سوچا“ کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ مزید تصویحات اب پیش خدمت ہیں۔ مفکرین مغرب کے عملی تجربہ کا ملخص کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (EWING) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

اگر وہ سو عصر حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب دیکھتا تو وہ نظام جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا (تمام حوالے خطاب کے ستر میں ملیں گے)۔

اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی تھی کہ اس میں لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں اور اس طرح حاکم اور محکوم کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن فرانسیسی مفکر رینی گوسن اس باب میں لکھتا ہے کہ :-

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہوگا جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ اس میں جو لوگ برسر اقتدار آجاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں وہ اپنے حاکم آپ میں یعنی حکومت عوام کی ہے۔

شکاگو یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (ALAN GEWIRTH) حقیقت کی نقاب کشائی ان الفاظ میں کرتا ہے :-

اس نظام میں ہر ایک یا قوم کے الفاظ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس میں درحقیقت محض موثر مابین اپنا وجود رکھتی ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہتی ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھتے تو نظریہ جمہوریت پرستیں خطابت کا پیدا کردہ افترا ہوتا ہے جس میں صداقت، نیکی اور حسن عمل کے الفاظ کے حربے چھوڑتے ہیں جن کے ساتھ یہ گروہ میدان کارزار یا مارکٹ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔

اس نظریہ کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اس میں حکومت، عوام کی رضا مندی سے قائم ہوتی ہے اور جو حکومت کسی کی رضا مندی سے قائم ہو اس کی فرائض پذیری اس پر لازم آجاتی ہے۔ لہذا جمہوری نظام میں برسرِ اقتدار گروہ کی حکمرانی استبداد نہیں چڑھتا، عوام کی بطیب خاطر رضا مندی پر مبنی نظام اطاعت ہوتا ہے۔ پروٹیسر (GEWIRTH) اس باب میں لکھتا ہے کہ یہ مفروضہ بھی محض انسانی ہے۔ اس نظام میں لوگ اس حکومت کی اطاعت پر بند ہوئے ہیں جبکہ اکثریت کی قائم کردہ ہوتی ہے جس اقلیت نے ان نامزدوں کے خلاف ووٹ دیئے تھے یا جنہوں نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے تھے۔ ان کی اطاعت کو بطیب خاطر اطاعت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

جمہوری نظام میں روسو کے مفروضہ کے مطابق، حق اقتدار عوام کی مرضی کو حاصل ہوتا ہے اور یہ اقتدار بلا حدود و قیود ہوتا ہے۔ فرانسیسی مفکر (BERTRAND DE JOUYENEL) نے (SOVEREIGNTY) کے نام سے ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے :-

برادری تعین یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے (HUMAN WILL) کو اقتدار مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظام ہائے حکومت ہی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظام ملکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی مدد سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ میں اقتدار پر یہ اصول اسے یکساں حق مطلق انسانی عطا کر دیتا ہے (صفحہ ۱۹۹)

اس مفکر کی اس تحقیق کے بعد اقبال کا وہ شعر پھر سامنے لائیے جو اس نے اس سے بہت پہلے کہا تھا اور جسے یہ شروع میں پیش قدمی کر چکا ہوں کہ :-

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از لوائے قیصری
آپ نے دیکھا کہ جس شخص کی بصیرت شمع قرآنی سے کپ ضیا کرتی ہو وہ کس قدر جلد حقائق کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے — کہ خارے دید و اعمال جن گفت۔ اور اسی بنا پر وہ حتم و یقین کے ساتھ (لیکن بغیر کسی "دعویٰ" کے) کہہ سکتا ہے کہ :-

خارشہ وہ جرابھی پر دوں اٹاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینہ اور لک میں ہے

پر مریب نے کہا تھا کہ انسانی ارادے کو مطلق اقتدار کا حق موندینے کا نتیجہ استبداد اور مطلق انسانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، خزاہ نظام کوئی سا بھی کیوں نہ ہو اس سے مغربی مفکرین کے سامنے یہ اہم سوال آیا کہ اگر انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر حق مطلق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ اپنی مدت الہم کے نگرانی جستیں کے بعد اس باب میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ انتہائی غور و تحقیق کا متقاضی ہے۔ ان ارباب فکر کا کہنا ہے کہ نظام حکومت مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک

عدل سے مراد | بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ بلند مقصد ہے قیامِ عدل۔ اس کے بعد عدل کے متعلق ان کی تفویحات اور تقاضے ملاحظہ فرمائیے۔ شیگن برنورسٹی کا فلسفہ کاہر فیئر (WILLIAM K. FRANKENA) لکھتا ہے کہ :-

عدل قوانینِ مملکت کے مطابق فیصلوں کو کہا جاتا ہے۔ قانون کی اصطلاح میں تو ایسا کہنا درست ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود مملکت کے قوانین ہی عدل پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق عملی اقدامات کو آپ سوشل جسٹس کس طرح کہہ سکیں گے۔ (5)

اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ اگر مملکت کے قوانین بہر حال مبنی برحق و صداقت قرار نہیں پاسکتے تو پھر حق و باطل اور (JUST AND UNJUST) کا معیار کیا ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں وہ پہرہ فیئر (LEWIS) کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ :-

حق اسے کہیں گے جو تمام حالات میں حق ہو اور ہر فرد کے لئے یکساں طور پر حق ہو۔ عالمگیریتِ حق کی بنیادی شرط ہے۔ (6)

نہ صرف عالمگیریت بلکہ ابدیت بھی — یعنی اسے ہر زمانے میں حق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں وہ ٹینیسن کا یہ شعر نقل کرتا ہے کہ: نیکی، صداقت یا پاکیزگی اللہ عدل ان سے ابدیت کی کشش نکال دیتے تو یہ سب راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائیں گے۔

اس کے بعد وہ (EMIL BRUNNER) کا یہ قول وضع کرتا ہے کہ :-

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں، ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے اوپر ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی معیار موجود ہے ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ کا مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی، اور یا پھر یہ چھوٹے نگوں کی مینا کاری اور خالی برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوگی۔ (7)

اسکندر ڈاؤنگ کیسج کے ایک ممتاز صاحبِ علم (ERNEST BARKER) نے سیاستِ مدن سے متعلق ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔ (PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY)۔

ابدی اور غیر متبدل قانون

وہ اس میں لکھتا ہے :-

اس مقام پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا مملکت کے آئینی قانون کے شانہ بشانہ کوئی ایسا قانون بھی موجود ہے جو حقیقی اقدار پر مبنی ہے۔۔۔۔۔ وہ قانون جسے ہم "فطری" کہہ سکیں کیونکہ وہ اشیائے کائنات کی فطرت، یا خود انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ قانون جو اس الحق پر مبنی ہوتا ہے جو اپنی ذات میں حق ہوتا ہے۔ جو اس عدل پر مبنی ہوتا ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں عدل ہوتا ہے۔ جو ان اقدار پر مبنی ہوتا ہے جو

اپنی قیمت آپ ہوتی ہیں، تمناہ انہیں آئینی حیثیت حاصل ہو یا نہ۔ یہ سوال آج کا پیدا شدہ نہیں ہے (SOPHOCLES) اور ارسطو کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ ارسطو نے اس قانون میں جیسے کوئی قوم خود وضع کر کے اپنے لئے اختیار کر لے اور اس میں جو تمام طرح انسان کے لئے عالمگیر ہو، تقریق کرتے ہوئے کہا تھا کہ مؤنوالہ کہ قانون، قانون فطرت ہے..... وہ قانون جو اس وقت بھی موجود ہوتا ہے جب نہ کسی قوم کا وجود ہو اور نہ کسی ایسے معاہدہ کا وجود جو مختلف افراد کو ایک رشتے میں منسلک کر دے۔ اس کی تائید میں ارسطو نے سوفوکلس کا یہ شعر درج کیا ہے کہ:-

اس قانون کی قوت، امروز و فردا کی پابندی نہیں ہوتی۔ وہ ایک دائمی چشمہ سے پھوٹتا ہے جس کے منبع کا کسی انسان کو علم نہیں۔ (مشہور)

اس کے بعد وہ (BLACKSTONE) کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ:-

قانون فطرت کی اطاعت دنیا کی سہر اطاعت پر مقدم ہے۔ انسانوں کا وضع کردہ کوئی قانون جو اس قانون فطرت کے خلاف ہو کبھی جائز قرار نہیں پاسکتا۔ (مست)

امریکی پروفیسر (EDWARD CORWIN) نے جو کانسٹیٹوشن اور اس کی تاریخ پر اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے ایک مہایت محققین بڑی پرفکر کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE HIGHER LAW)۔ اس کی بحث و تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ آئین کی بنیاد ان اصول و اقدار پر ہوتی چاہیے جو انسانوں کی وضع کردہ نہ ہوں اور زمان و مکان کی حدود سے ناکشا ہوں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یہ نظریہ کہ مملکت کے آئین کو اس لئے بالادستی (SUPREMACY) حاصل ہے کہ اس کی جڑیں عوام کے ارادے (پاپولر ویل) کی پیدا کردہ ہیں، امریکن آئین میں بعد کا پیدا شدہ ہے۔ ابتدا میں آئین کی فوقیت کا بنیادی معیار غیر متبدل اور لا ابدی عدل کا تصور تھا اور انسانی ارادہ کو اس میں نسبتاً بہت کم دخل تھا۔ یہ نظریہ موجودہ قانون کی ضد تھا۔ اس میں اس حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا کہ کائنات میں حق و صداقت اور عدل کے ایسے اصول موجود ہیں جنہیں اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی قدر و قیمت کی بناء پر باقی اصولوں پر غالب رہیں، اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ قوم کے برسرِ اقتدار طبقہ کا اس بآب میں کیا طرزِ عمل ہے۔ ان اصولوں کو کسی انسانی ہاتھ نے نہیں بنایا۔ یہ اصول اگر خود خدا سے قیوم نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ ان کی رو سے خدا کا ایسا تصور سامنے آتا ہے جو انہیں کنٹرول کرتا اور باہم مدبر مربوط رکھتا ہے۔ یہ اصول موجودی الخارج..... اور ادلی ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ (مست)

اس کے بعد کاوٹن، مشہور متفنی (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:-

حقیق قانون، یعنی برحمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ قضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے، منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فرقہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہمارے پارلیمان اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی اطاعت سے آزاد کر دے..... نہ ہی اس قانون کی یہ کیفیت ہے کہ وہ آگے کے لئے آگ قانون ہو اور پیچھے کے لئے آگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک انلی،

غیر متبدل قانون ہے جو اہم طود پر تمام اقوام کو اپنی رنجیروں میں بکڑے ہوئے ہے۔ (ص ۱۸)

اس کے بعد (CICERO) کے یہ ناقابل فراموش الفاظ درج کرتا ہے کہ
سچا قانون وہ ہے جو فطرت کے عطا کردہ معیار کے مطابق حق اور باطل میں امتیاز کرے۔ اس کے سوا
کوئی قانون بھی ہر اسے نہ صرف یہ کہ قانون سمجھنا نہیں چاہیے۔ اسے قانون کہنا ہی نہیں چاہیے۔ (ص ۱۹)
نہ صرف یہ کہ ایسے قانون کو قانون سمجھنا اور کہنا نہیں چاہیے (BARKER) کہتا ہے کہ ایسے قانون کی اطاعت ہی
نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

ملکت کے ساتھ میری وفاداری (LOYALTY) ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفظ کے لئے ملکت
کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر یہ ملکت ان اقدار کی وفاداری نہیں رہتی تو ان اقدار کے تقاضے کی رو سے
میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدم وفاداری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں
پذیری کے بجائے بادل ناخواستہ مزاحمت کی رویش اختیار کر لوں۔ (ص ۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ ملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رو سے ہم
پر اس کی اطاعت بہر حال واجب ہو۔ اس کے بجائے امر واقعہ یہ ہے کہ ملکت عمل کی مظہر اور اسے
عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر ملکت کے ارشاد اختیار کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی
ہے کہ ملکت عمل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر ملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفا
شعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے (ص ۱۹)

آگے چل کر وہ کہتا ہے :-

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب بشرط ہوتا ہے مطلق نہیں ہوتا یہ اطاعت مہرجالت میں
واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب ہوتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضا کے ساتھ
ٹکراتے نہیں۔ (ص ۲۰)

آپ نے غور فرمایا عزیزان! کہ نظام جمہوریت کے تلخ نتائج کا شکار ہوا انسان اب کس قسم کے قانون کی تلاش
میں ہے۔ ایک انہی واہدی، عالمگیر قانون جس کا مندرجہ ذیل انسانی فکر سے بلند اور مادی و مادی ہو !
اس کے بعد مغرب کا یہ منکر بعد حمان و یاس، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے کہ جمہوری نظام کے ہاتھوں
تنگ آئے ہوئے متلاشیان حقیقت کی مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے قوانین فطرت کا ضابطہ کب ہیں موجود نہ تھا۔

(BARKER . P. 100)

انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط کا ستیا یا ہوا انسان آج بھی اپنے آپ کو اسی مقام پر پاتا ہے جہاں اس نے انسانی
مفکرین مغرب کی دشواری | تھا جس نے ملکیت اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد سے نجات کی راہ نظام
جمہوریت میں سمجھی تھی۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ جسے چشمہ حیات سمجھ کر
اس کی طرف لپکا تھا وہ صواب ثابت ہوا۔ اور چشمہ حیات کا اب بھی اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا اگرچہ اس کی تلاش
میں وہ اس قدر سرگرداں و حیران اور مضطرب و بیتاب ہے۔ ان کی فکر نے انہیں اتنا توتا دیا ہے کہ وہ ضابطہ قوانین

جس میں انسانیت کی نجات کا لازماً مغرب ہے، کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ وہ ازلی ابدی انومان و امکان سے ماوراءِ علمگیر ہونا چاہیئے۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہیں کہ ایسا قانون انسانوں کا خود ساختہ نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر ایسا ضابطہ قوانین وضع ہی نہیں کر سکتی۔ اس کا سرچشمہ انسانی فکر سے ماوراء ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں تک تو پہنچ گئے ہیں۔ لیکن وہ اُسے منقول من اللہ یا وہی کہہ کر نہیں پکارتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گرتے ہیں کہ اگر ہم نے اُسے قانونِ خداوندی کہہ دیا تو پادری یہ کہتے ہوئے بھاگے بھاگے آجائیں گے کہ جس قانونِ خداوندی کے ہم متقاضی ہو وہ قانونِ ہم دے سکتے ہیں کیونکہ ہم خدا کے ماتحت رہتے ہیں۔ اس سے ان پر تھیا کر لیبی کا وہی استدلال پھر مسلط ہو جائے گا جس سے چوٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نظامِ جمہوریت وضع اور اختیار کیا تھا۔ اس گھر سے وہ اپنے مطلوبہ ضابطہ قوانین کو قانونِ فطرت یا فطرتِ انسانی یا مشرقی قانون جیسی مبہم اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی دوسری شکل یہ ہے کہ انہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ قانون ملے گا کہاں سے؟ فکرِ مغرب کی یہی بے کلی اور بیانی اور دوسری طرف بے بسی اور بے چارگی تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

مشقِ ناپید و غمزدی گزشتہ روز
عقل کو تابعِ غنہ و بے نظر کرنے کا

اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

جس نے سورج کی شعاعوں کو گزشتہ کیا
زندگی کی شبِ تاریک صحر کر دے گا

مغربی اقوام کی بے بسی کا تو یہ عالم ہے کہ مسلمان کی حالت ان سے بھی عجیب تر ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی مسلمانوں کی حالت

انگریزوں کو سلب کر دیا ہے۔ محکومیت اس لئے بدترین لعنت جوتی ہے کہ اس میں اقبالؒ کے الفاظ ہیں — "جاں بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر" ہوتے ہیں۔ محکوم اگر کسی وقت اپنے بدن کو (حاکم قوم) کے قبضہ سے بچھڑا لیتا ہے تو بھی اس کی جان اس کے قبضے میں بدستور رہتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے اس کی آنکھ سے، سنتا ہے اس کے کانوں سے، سوچتا ہے اس کے دماغ سے۔ وہ قومِ غالب کے ہر نظریہ مسلک یا نظام کو عرشِ معلیٰ سے نازل شدہ سمجھتا اور اس کی تقلید کو اپنے لئے موجبِ فخر و مباہات قرار دیتا ہے۔ اقوامِ غالب اپنی چوڑی ہونٹیں بڑیاں اس کی طرف پھینکتی ہیں اور یہ انہیں لگتا کہ اٹھانا اور اپنے لئے خواہیے یا نہ سمجھتا ہے حصولِ آزادی (تشکیلِ پاکستان) کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفہٴ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھایا اور عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ لگا کر اسے بکمالِ فخر و مباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت یہ نظام خود اقوامِ مغرب کے ہاں ناکام تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے، وہاں کے مفکرین کسی دوسرے نظام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہمارے ہاں شروع میں تو اس نظام کی حیثیت سیاسی ہی تھی لیکن جب مذہبی پیشوائیت کے سینے میں ہر کس اقتدار نے انگریزوں کی طاقت کا سرچشمہ تقلید پرست علوم کی مذہب سے وابستگی کا جذبہ نکھا۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور "بحالِ جمہوریت" کی ترکیب چلائی۔ اس طرح اُس نظام کو جو سیکولر اقوام کے ہاں بھی مردود قرار پا چکا تھا، عین اسلامی کہہ کر علوم کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اُس آزادی کا حصول تو درکنار جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا، ہم مغرب کی شکست خوردہ

اتلام کے حاشیہ برادر (CAMP FOLLOWERS) بن کر رہ گئے۔

قسط آئی نظام

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوری نظام کی اصل و اساس اس مفروضہ پر ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ انہی کو حق حکومت پہنچنا ہے اور ان کے نمائندوں کی اکثریت کو آئین و قانون سازی کا حق حاصل ہونا ہے۔ مگر اس سے اس مفروضہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ (گروہ)۔ قرآن کریم کے اس اولین اصول کی رو سے ایک طرف مغربی نظام جمہوریت خلافت اسلام قرار پا جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے آزادی اور غلامی کا صحیح تصور سامنے آ جاتا ہے۔ اس کی رو سے انسانوں کی حکومت خواہ وہ اپنی قوم کی ہو اور خواہ کسی دوسری قوم کی، بہر حال غلامی ہے۔ اس سے علامہ اقبالؒ کے اس جواب کی حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے جو انہی نے (مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کو دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلا جائے اور اس کی جگہ اہل ہند کی اپنی حکومت قائم ہو جائے تو ہندو کے نزدیک بیٹک یہ آزادی قرار پا جائے گی۔ لیکن مسلمان کے نزدیک جو قرآن کا متبع ہے یہ بدستور غلامی کی غلامی رہے گی اور ایک باطل نظام کو بٹا کر اس کی جگہ دوسرے باطل نظام کا قیام۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا یہ منشاء تو ہو نہیں سکتا کہ انسانوں میں نظام حکومت سرے سے ہو ہی نہ۔ وہ انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے

حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے

نظام حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ **إِن الْحُكْمَ وَالْأَمْرَ لِلَّهِ** (پھر) وہ اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ **لَا يَشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدٌ** (پھر) بنابرین۔ **أَمَرَ الْأَنْفَالُ وَاللَّيْلُ**۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کی جائے۔ **ذَٰلِكَ السِّلَاسُ الْأَقْوَمُ**۔ تو لوگو! اکثر اللہ اس لا ھیکل کوٹ۔ (پیر) یہی حکم نظام حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت (FORM) بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی تعبیریں تو کر کے آزادی حاصل کر لی ہے۔ ہیئت کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

لیکن اس سے وہ خدشہ مٹنے آ جاتا ہے جس سے مجروح ہو کر اہل مغرب کے نظام جمہوریت اختیار کیا تھا۔ وہیں مذہبی پیشوائیت نے یہی کہا تھا کہ حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خدا کو حاصل ہے، لیکن خدا اپنی حکومت اپنے نمائندگان کے ذریعے قائم کرتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیارات تفویض کر دیتا ہے۔ ہم اس کے تادم سے ہیں، اس لئے ہماری حکومت انسانوں کی حکومت نہیں، خدا کی حکومت ہے۔ اس سے نظیرا کسی کا وہ نظام حکومت وجود میں آ گیا جو لوگویت سے بھی بدتر تھا۔ لوگویت کے خلاف تو بغاوت بھی کی جاسکتی تھی جس کی نوعیت بہر حال سیاسی تھی جاتی تھی۔ خدا کے من (مزعوم) نمائندوں کے خلاف بغاوت، خدا کے خلاف بغاوت قرار پا جاتی تھی۔

قرآن نے کہا کہ خدا کی حکومت، خدا کی کتاب (یعنی قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں ہوگا، کیونکہ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیا۔ اس کا عملی ذریعہ کتاب اللہ کی حاکمیت ہے۔ کرنا۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خود زبان نبویؐ

سے کہلایا گیا کہ اَفْعَيْزَ اللّٰہِ اَتَّبِعْنِ حَکْمًا وَهَؤُلَاءِ السِّیِّئَاتِ اَتَّبِعْنِ کُفْرًا مَّفْضَلًا۔ (۱۰۶) ”کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کروں، حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے جو مفصل ہے۔“ یہاں سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ تمہارا یہی اس لئے وجود میں آئی تھی کہ خدا کی کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی جو ضابطہ زندگی بن سکتی۔ اس لئے جب خدا کی حکومت کا اصول تسلیم کر لیا جاتا تھا تو اس کے بعد لوگوں کو لازماً مذہبی پیشوائیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کا اعلان خود ذات رسالت مآب سے کرانے میں حکمت یہ تھی کہ دنیا میں اگر کوئی انسان خدا کا نمائندہ بن سکتا تھا تو اس کا اولین حق بہر حال رسول اللہ کو پہنچنا تھا جب حضورؐ نے بھی یہ فرمادیا کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل قرار دیا گیا۔ اس نظریہ کی رو سے حکومت خدا کی کتاب کے احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی قرار پاگئی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس نظریہ کی صداقت کا تسلیم کر لینا ایمان قرار پایا اور اس سے انکار کفر و بدعت نامہ میں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یُحْکَمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولَٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُونَ۔ (۱۰۷)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہؐ سے فرمادیا گیا کہ۔ وَ اِنْ اَحْکَمْتُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ۔ (۱۰۸) ”ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔“ گویا یہاں پھر دہرا دیا کہ یہ حکومت تمہارا یہی نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اللہ کی حکومت ہوگی۔ قرآن کریم نے خدا کے سوا ہر انتہائی کو طاغوت کہہ کر بکا رہا ہے اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ فَکَفَرُوا یُکْفَرُ بِالطَّاغُوتِ وَیُؤْمِنُ بِاللّٰہِ فَقَدْ اَسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا یُفْصِمُ لَهَا۔۔۔ (۱۰۹) ”جو خدا پر ایمان لایا اور اس نے طاغوت سے کفر برتنا تو اس نے ایسا عزم سرشتہ تھا مگر لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔“ اور اس ”کفر بالطاغوت“ کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ ”کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو بہ عم غریش سمجھتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔ لیکن عملاً ان کی حالت یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اَنْ یَّکُوْنُوْا کَکُلِّ اِلٰہٍ الطَّاغُوتِ (۱۱۰) ”ہم معاملات کے فیصلے طاغوت سے کر لیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت سے کفر برتیں۔“ یہاں سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ خدا پر ایمان سے عملاً مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے لئے اس کی کتاب کو اختیار لی تسلیم کیا جائے۔ اگر اس سے سوا کوئی اور اختیار لی تسلیم کر لی گئی تو یہ کفر ہوگا۔ اس کتاب کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اسے مفصل کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَحَقَّقَتْ کَلِمَۃُ تَرٰوْکَ حَسْبًا قَاوِمًا لَّا لَآ مُبَدِّلَ لَیْکُمُھِمْ۔ (۱۱۱) ”خدا کے کلمات (قوانین) خداوندی (مدق و مدلل) کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔“ بالفاظ دیگر یہ ضابطہ خداوندی مفصل، مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی۔ (۱۱۲)

پہلے جس قسم کے ضابطہ سیاسیات کی منظر میں مغرب کو تلاش تھی لیکن وہ انہیں کہیں سے ملتا نہیں تھا، وہ سامنے آ گیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، منظرین مغرب اپنے عقلی و تجرباتی طریق سے اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ اسی قسم کا ضابطہ اور نظام انسانی مشکلات کا حل پیش کر سکتا ہے لیکن ابھی اس کا مزارع نہیں ملتا کہ وہ ضابطہ ملے گا کہاں سے؟ اگر ان کے سامنے قرآن اپنی حقیقی شکل میں آجائے تو وہ یقیناً اسے لپک کر اٹھالیں۔ اس کے راستے میں رکاوٹ

کہا ہے اسے نہیں دلا آگے چل کر بیان کر دیں جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک خدا کی کتاب کے تابع زندگی بسر کرنا ہی آزادی ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حکومت کس کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے۔ اگر حکومت خدا کی کتاب کی نہیں تو یہ آزادی نہیں، مخلوقی ہے، غواہ اس مملکت میں اقتدار خود اپنی قوم کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ انسانوں کو آزادی صرف کتاب اللہ کے تابع رہنے سے مل سکتی ہے۔ ارشاد ہے۔ **قَدْ يَكُونُ الْمُؤْمِنُ كَهَمِّ ذُو الْأَمْنِ أَهْلُ الْكِتَابِ وَالْمُتَّقِينَ كَيْفَ يُؤْمِنُ الْمُتَّقِينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَاتُ**۔ اہل کتاب ہوں یا مومن کہیں؟ کہے باشندے انہیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی تاؤ تفسیر کہ ان کے پاس واضح حقیقت نہ آ جاتی — یعنی اللہ کا رسول نہایت پاکیزہ مصالحت لے کر — **رَفِئَهَا الْكُتُبُ قِيَامُهَا**۔ (میں) وہ صحیفہ آسمانی جس میں نہایت حکم قوانین ہیں۔" تو یہ انسان کو حقیقی آزادی اس کتاب کی اطاعت سے مل سکتی تھی۔ اسی سے انسانوں کی حکومت کی وہ زنجیری ٹوٹ سکتی تھیں جن میں تو یہ انسان جکڑی چلی آ رہی تھی اور اسی سے وہ بوجھل پھیلے ان کے سر سے اتر سکتی تھیں جن کے بوجھ تلے وہ اس بُری طرح دی ہوئی تھی۔ (۱، ۲)

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں حکومت، قرآنی احکام و اقدار کے نفاذ کی ایجنسی ہے۔ بالفاظ دیگر اسے قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا منصب قوانین خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی حیثیت صرف اجرائیہ یا انتظامیہ کی رہ جاتی ہے۔ **استخلاف فی الارض** میں اسے استخلاف فی الارض کہا جاتا ہے۔ یہیں سے لفظ خلیفہ ہے۔ (ضمنی) یہ خبر ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جس کی مدد سے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ خدا نے اپنے اختیارات اپنے نامندوں (کلیسا) کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت پہلے ہی کی جا چکی ہے۔ (اسی تصور سے متاثر تھا وہ جن جن نے ایک دفعہ حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفہ اللہ کہہ کر پکا مانوا آپ نے اسے سختی سے روک دیا اور فرمایا کہ خدا کا خلیفہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں خلیفۃ الرسولؐ (یعنی رسول کا جانشین) ہوں۔ اور حضرت عمرؓ نے اسے سے التباس کے امکان کو بھی حتم کرنے کے لئے خلیفہ کے بعد نے امیر المؤمنین کا لقب اختیار فرمایا۔

بہر حال بات "استخلاف فی الارض" کی جو وہی تھی میں سے مراد ہے وہ نظام حکومت جس کی اُرد سے قرآنی احکام و اقدار کو نافذ کیا جائے نہ مادہ قدیم میں حب ہونہ اقتدار کا مرکز شخصیتیں ہوتی تھیں اللہ تعالیٰ نے افراد کو خلیفہ کہہ کر پکارا۔ سورہ صافات میں حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے۔ **يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ**۔ (۱۳۱)۔ اسے داؤدؑ نے نہیں بلکہ میں خلیفہ بنالیا ہے سو تم لوگوں میں الحق (وہی خداوندی) کے مطابق حکومت قائم کرو۔ لیکن جب تو یہ انسان اپنے بچپن کی منزل پس طے کر لینے کے بعد عالم شباب تک آپہنچی تو شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا اور عالمگیر انسانیت کے لئے وحی کی رہنمائی میں اپنے معاملات آپ طے کرنے کا نیا دور شروع ہو گیا۔ تاریخ میں حضور رسالتؐ آئے۔ اس دور کہیں کے اختتام اور عصر جدید کے آغاز کے نقطہ انصال پر فائز نظر آتے ہیں۔ ختم نبوت کا اعلان اسی انقلاب کی تمہید ہے۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر استخلاف فی الارض، اشخاص کے بجائے امتوں

کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیا آپ نے اس پر کبھی غور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کے متعلق تو فرمایا کہ **وَتَجَعَلَنَّاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ**۔ لیکن حضور خاتم الانبیاءؐ کے زمانے میں کہا کہ **وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَيْنِهِمْ**۔ تم میں سے جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو تسلیم کریں گے اور ان کے اعمال اس پیمانے پر پورے کریں گے تو انہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا۔ یہ خدا کا وعدہ، یعنی اس کا غیر متبدل قانون ہے۔ "یعنی اب استخلاف فی الارض اشخاص کے بجائے امتوں کے حصے میں آئے گا۔ سوچئے عزیزان! کہ اس انقلاب عظیم کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے اُمّی زمانے میں ہوا جب ساری دنیا میں شخصی حکومتوں کا دور دُور تھا اور افراد کی جگہ اُمّیوں کی حکومتوں کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ رد سو کا فلسفہ اور انقلاب فرانس تو ابھی کل کی بات ہے۔ قرآن کریم کے تجزیہ کردہ نظام کی رو سے استخلاف فی الارض، امت مسلمہ دینی امت محمدیہ کے حصے میں آیا۔ اس امت سے کہہ دیا گیا کہ ان احکام و قوانین کی کارفرمائی کے لئے جو عملی پروگرام تجویز ادا اختیار کیا جائے گا وہ بھی کسی ایک فرد کا طے کردہ نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے باہمی مشورے سے طے ہوگا۔ **وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ**۔ (پہلا)۔ حتیٰ کہ اس نظام کے سربراہ اول جو بہر حال رسول اللہ ہی ہو سکتے تھے، سے بھی تاکید کر دی کہ **وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ** (دہرا)۔ "ملکت کے معاملات طے کرنے کے لئے افراد امت سے مشورہ کیا کرو۔ ان احکامات کی رو سے، قرآن کریم نے ہر قسم کی شخصی حکومت — لوکیت یا آمریت — اور ان کے ساتھ ہی تھی یا کسی کا خاتمہ کر دیا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استخلاف فی الارض یعنی نظام حکومت مقصور بالذات نہیں تھا، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اور وہ بلند مقصد تھا قرآنی اصول و اقدار اور احکام و قوانین کا نفاذ و اجراء۔ سورہ النور میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ایمان و اعمالی صالحہ کے نتیجے میں تمہیں استخلاف فی الارض حاصل ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ استخلاف اس لئے دیا جائے گا۔ **وَلِيُكَلِّمَهُمْ وَلِيُنْذِرَهُمُ الْيَوْمَ الَّذِي يَأْتِيهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ**۔ (دہلا) تاکہ اس سے اس دین کا ممکن ہو جائے کہ وہ نظام زندگی قائم اور (ESTABLISH) ہو جائے جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے۔ ملکت کے اس فریضہ کو دیگر مقامات میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن کی سند قبولیت حاصل ہو، اور ان سے لوگوں کو روکنا جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں سورہ حج میں ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر
الَّذِينَ إِذَا تَكَلَّمُ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ
وَأَمَرُوا بِآلِهِمْ طَهْرَتٍ وَكَانُوا مِنَ الْمُنْكَرِ (پہلا)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں ممکن ہوگا تو قیامت صلوٰۃ اور اتانے زکوٰۃ ان کا فریضہ ہوگا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کے ممکن کا مقصد۔ اس میں تمام معاملات انجام کار خدائی پروگرام کی تکمیل کے لئے سرانجام پائیں گے۔

پھر دیکھو آدیا جائے کہ جو تکوینی ممکن فی الارض پوری کی پوری امت کو حاصل ہوگا نہ کہ کسی ایک فرد یا گروہ کو اس لئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ بھی پوری کی پوری امت کا ہوگا نہ کہ کسی ایک گروہ کا۔ سورۃ آل عمران میں ہے **كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ**۔ (پہلا)۔ تم بہترین امت

ہو جسے نوع انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی من المنکر ہے۔ یہی اس امت سے کہا گیا اور یہی اس نظام کے سربراہ اہل حضور نبی اکرم سے (۱۰۶)

متعدد مقامات پر اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس نظام میں امت شکر خود رسول اللہ کو بھی اس کا اختیار نہیں ہوگا کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ضابطہ حیات (قرآن کریم) میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکیں۔ مخالفین کہتے کہ ہم اس نظام میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ آپ اس ضابطہ میں کچھ تبدیلیاں کر دیں۔ اس کے جواب میں حضور فرماتے کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَدَّ لَهُ مِنْ تَلْفَازٍ نَفْسِي - یہ میرے جیٹھ اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔ اِنْ أَتَيْتُمْ إِلَّا مَا لَكُمْ حَتَّى آخِرَ - میں تو خود بھی اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اِنَّ الْخَافَ اِنْ عَصَيْتُمْ رَبِّيْ عَذَابَ اَبَدٍ يَوْمَ يُخْلِفُ الْكَافِرُ - اگر میں بھی اس کی نافرمانی کر دوں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

یہاں سے ایک اور اہم نکتہ سہارے سامنے آتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ میں خود اسی ضابطہ قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے واضح ہے کہ اطاعت ضابطہ خداوندی (قرآن کریم) ہی کی ہے۔ اسلامی نظام مملکت اس کی اطاعت کرانے کی شینری منع کرتا ہے۔ ان تصریحات کے بعد ہم اس ارشاد خداوندی کو سامنے لاتے ہیں جو کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں

نظام حکومت اسلامی کی اساس و بنیاد اس موضوع پر صرف آخر ارد
تمام نوع انسانی کے لئے حقیقی آزادی کا منشور (CHARTER) ہے۔ اسے غور سے شیخ۔ ارشاد ہے۔
مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ أَنْ يَتَّبِعَ الْكُتَابَ وَالْحُكْمَ وَالشُّعْرَةَ لِيُتَّقُوا لِلنَّاسِ مَخْلُوعًا
بَلَىٰ مَسْئَرٌ وَّوَيْبٌ لِلنَّاسِ وَذِكْرٌ لِّكُلِّ نَفْسٍ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ الْكِتَابُ وَبِمَا كُنْتُمْ
تَدْعُونَ تُسْوَوْنَ - (۱۰۷)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا۔ خواہ خدا اسے ضابطہ قوانین یا حکومت یا نبوت بھی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتاب کی اطاعت کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو۔ اللہ کے محکوم (ربانی) بن جاؤ۔

یہ آیت جلیلہ اسلامی نظام حکومت کا دستور اساسی یا نوع انسان کے لئے آزادی کا چارٹر ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اطاعت یا محکومیت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کی جائز نہیں۔ خلوہ وہ اطاعت انسانوں کے وضع کردہ ضابطہ قوانین کی دوسرے ہو (کتاب)۔ خواہ انطا مہد کی ہو (حکم) حلقہ نبی کی بھی نہیں (نبوت)۔ اسلامی نظام میں اطاعت اور محکومیت کتاب اللہ کی ہوگی۔ وہ نظام جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ

کس و ہر جا سائل و محروم نیست عبد و مولا۔ حاکم و محکوم نیست

یہی تھا وہ مقصد جس کے لئے اس خطہ زمین کو حاصل کیا گیا تھا لیکن آج تک اس مقصد سے محروم ہے۔ یہاں ایک دن کے لئے بھی کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ لہذا، ہمیں وہ آزادی نصیب ہی نہیں ہوئی جس کی ضامن خدا کی یہ کتاب ہے اور جو دہ شرف انسانیت ہے۔ قرآنی آزادی تو ایک طرف یہاں تو مطلب کا نظام جمہوریت بھی اپنی حقیقی شکل میں

قائم نہیں ہو سکا۔ یہاں کسی نہ کسی رنگ میں آمریت ہی کا دور دورہ رہا جو غلامی کی بدترین صورت ہوتی ہے۔ ہماری مذہبی پیشہ روایت، آمریت کے خلاف تو اعلان جنگ کرتی ہے لیکن مغربی جمہوریت کو عین مطابق اسلام قرار دیتی ہے جس میں اکثریت کے فیصلوں کو برحق تسلیم کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں اقلیت دین کے سب سے بڑے مدعی حضرت اسلامی کے بانی ابو اللہ اعلیٰ مودودی صاحب ہیں۔ وہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں ایک دلیل یہ بھی دیا کرتے تھے کہ:

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت اپنی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل نفرت مسلمان اور موجودہ سیاسی شکست خوردہ قوم (۱۳۱)

اکثریت کا نظام | پاکستان میں اگر انہوں نے (صدر الوبیکہ) دو بکے انتخابات کے ذریعے (اپنے اس مسلک کا اظہار فرمایا کہ:

اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (امر دہ موزونہ، ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

آج بھی ہمیں مودودی صاحب کے دین کے معاملے میں بھی اکثریت کے اصول کو حق کا معیار قرار دے دیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ: اگر شریعت کو ملک کا دستور اور آئین بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا) تو جمہوریت کے مسلم قاعدہ کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور آئین کی شکل اختیار کرے گی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حقیقی ہے۔۔۔ لہذا اس کا قانون حقیقی تعبیر شریعت پر مبنی ہو گا۔ (ترجمان القرآن، باب ۱۰ جون - جولائی ۱۹۶۳ء)

چنانچہ اب ملک میں حقیقی فقہ پیگ لازم کی حیثیت سے نافذ کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ میں متعدد بار واضح کر چکا ہوں، میرا تعلق کسی نہ یہی فرقے سے نہیں۔ اس لئے میں نہ کسی فرقہ کی فقہ کے حق میں ہوں نہ کسی فرقہ کی فقہ کے خلاف۔ میں تو قرآن مجید کا طالب علم ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ ہر پیش آمدہ معاملے کے متعلق یہ واضح کر دوں کہ اس کی یا بت قرآن مجید کا کیا فیصلہ ہے۔ قرآن مجید کی مدد سے اکثریت یا اقلیت کے معیار حق و باطل قرار پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اکثریت کے متعلق تو وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے۔

وَإِنْ تَطِيعُوا أَمْرًا مِّنَ الْأَمْرِ الَّتِي يُحْمَلُونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (پڑھ)

اگر تو دنیا کے باشندوں کی اکثریت کی اطاعت کر لے لگ جائے گا تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے مگرا کر دیں گے۔ وہ محض ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور قیاس آرائیوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔

اور تو اور خود مودودی صاحب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

اسلام تعداد کی اکثریت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ

مذہبی مغربی جمہوریت کا مسلم قاعدہ دین میں حق و باطل کا معیار قرار دیا جا رہا ہے (استغفر اللہ)

اس کی تائید میں ایک جہم فقیر نہیں۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی - ص ۴۵-۴۶)

بہذا کسی عقیدہ، نظریہ یا مسلک کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ اکثریت اس کے حق میں ہے اس لئے وہ برحق ہے مغرب کے نظام جمہوریت کے لئے مطابق ہے لیکن قرآن کریم کے یکسر خلاف۔ کیا یہ مقایم حیرت نہیں کہ مغرب کے مفکرین تو اس اصول کو باطل قرار دیتے رہے ہیں اور ہمارے ہاں کے مدعیان اقامتِ دین اسے حق کا معیار بتا رہے ہیں؟ مغرب کا مستہزور مفکر برتا اس باب میں لکھتا ہے:-

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔ قوت کسی شکل میں ہو اس کے پیچھے نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجو فولاد کی۔ دولت کی ہو یا ذہنی برتری کی۔ کسی انفر کی ہو یا حاکم کی۔ کسی پادری کی ہو یا پروت کی۔ قوت بہر حال قوت ہے اور خدا کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے۔ ان سب میں سب سے زیادہ حجاب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنا تعداد کے دور پر اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

۲۴۲ (THE MAKING OF HUMANITY)

قرآن کریم کا ایک ارشاد ہے جس پر غور کرنے سے ایک مسلمان کپکپا اٹھتا ہے۔ وہ ارشاد یہ ہے:-
وَمَا يَكُونُ مِنَ الْفِتْرِ يَتَّبِعُ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا هُمْ يُشْرِكُونَ (پہلا)
ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں سے اکثر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس دعوے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔

میں نہ کسی کے خلاف کفر کا قدیمی صارف کیا کرتا ہوں نہ کسی کو مشرک قرار دیا کرتا۔ میں اس قسم کی جرأت کے خلاف خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ لیکن قرآن کریم جن امور کو مشرک قرار دیتا ہے ان کی وضاحت فریضہ خداوندی سمجھتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی ایسی بنیادی گمراہی ہے جس سے انسان دعوئے ایمان کے باوجود مشرک کا مشرک رہتا ہے؟ اس کی وضاحت قرآن کریم نے خود ہی کر دی۔ سورہ الزمر میں ہے:-

وَإِذَا أَدَّكَرَ اللَّهُ وَحَدَّكَ أَشْمَانُ بَكَتْ قُلُوبُ الَّذِينَ يَتْلَوْنَ الْكِتَابَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا أَدَّكَرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَمْتَشِحُونَ (پہلا)

جب خالصتاً خدا کے قانون کی بات کی جاتی ہے تو جو لوگ آیت کے منکر ہیں انہیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن جب اس کے ساتھ اوروں کو بھی ملا دیا جائے تو وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔

اس کی وضاحت اس سے اگلی سورہ میں ان الفاظ میں کر دی گئی:-

ذَٰلِكُمْ بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ وَإِنْ يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُونَ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (پہلا)

تمہارا یہ انجام اس لئے ہوا کہ جب تمہیں خالصتاً خدا کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم اس سے انکار کرتے تھے لیکن جب اس کے ساتھ انسانوں کو ملا دیا جاتا تھا تو تم ایمان لے آیا کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ خدایت

صرف خدا کو حاصل تھا۔ کبریا ئی بھی اس کی تھی اور اقتدار اعلیٰ بھی اسی کا۔

یعنی لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (پہلے) وہ اپنے احکام میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ دوسری جگہ فرمایا،
اَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ اشْرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ (پہلے)

کیا ان لوگوں نے خدا کے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جو ان کے لئے قوانین شریعت وضع کرتے ہیں حالانکہ اس کے لئے خدا نے کوئی اجازت نہیں دی۔

یہ کون لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اختیار مطلق میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت خود حضور نبی اکرمؐ نے فرمادی۔
حبیب یہ آیت نازل ہوئی: اَلْخُذْ قُوَّةً بِمَا نَزَّلْنَا مِنْ قَبْلِكَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَكُوْنَ حُدُودَ اللَّهِ (پہلے)۔ ان اہل کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے۔ "تو ان کی طرف سے یہ اعتراض ہو کہ ہم نے انہیں خدا قرار نہیں بنا رکھا۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ یہ تمہارے لئے قوانین شریعت وضع کرتے ہیں۔ جیسے یہ حلال قرار دے دیتے ہیں تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو۔ جسے حرام کہہ دیتے ہیں تم اسے حرام سمجھ لیتے ہو۔ یہی تو انہیں خدا بنا دیتا ہے!"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اَوَلَمْ يَكْفِیْكُمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتَابَ یٰحَبِیْطُ عَلَیْهِمْ (پہلے) کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ کیا دین کے معاملہ میں کتاب اللہ کافی نہیں ہے؟ ہمارے اجارہ و رہبان و مذہبی پیشوا (یعنی پرستار خدا کر دھڑلے سے کہتے ہیں کہ یہ کتاب کافی نہیں۔ "مذہب" اس کے ساتھ اس کی مثل لیکن رفقہ رفقہ، "اس کے ساتھ" کا تصور ختم ہو گیا اور باقی صرف "خارج از دستران" رہ گیا۔ چنانچہ اب دین کے لئے "خارج از قرآن" کا نیا پرچہ چکا ہے۔ قرآن کا نام تبرکاً باقی رکھا ہے۔ احکام خداوندی میں انسانوں کو شریک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو منقرض خصوصیات احکام خداوندی کو حاصل ہیں انسانوں کے وضع کردہ قوانین و احکام کو انہی صفات کا متصف قرار دے دیا جائے۔ احکام و قوانین خداوندی کی بنیادی خصوصیات ابدیت اور لاتبدلیت ہیں۔ یعنی وہ ہر زمانے میں نازل و عمل رہتے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ احکام فقہ کے مرتب کرنے والے آئمہ کرام کا مقام کنشائہ مقام بلند کیوں نہ ہو ان کے احکام تابدلی ہو سکتے ہیں۔ غیر متغیر۔ انہیں الیا قرار دینا قرآن کریم کی نصوص صریحہ کے مطابق شرک فی التوحید ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے اور تو اور خود خود وحی صاحب بھی متفق ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

بجہد خواہ کنشائہ یا کمال کیوں نہ ہو زمان و مکان کے تعینات۔ سے ماکمل آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تہذیبیات۔ حصہ دوم۔ ص ۲۲)۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی اہل کتاب سے اقتساب کرے دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اہل تاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسان فی عقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قید سے منقید ہوتا ہے (تہذیبیات۔ ص ۲۱)۔ اس کے برعکس :-

تمام زمانے و مکانات و ممالک و ممالک سے آباد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم پر زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ (تفہیمات ص ۱۳)

لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ حضرات کہتے ہیں اور کرتے ہیں: یہاں فقہی قوانین کو شریعت خداوندی کہہ کر نافذ کیا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ یہ فقہ خدا کی نہیں، انسانوں کی وضع کردہ ہے۔ پھر ان فقہی قوانین پر اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان نے غور و فکر کیا۔ یہ بھی بر حال انسان ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ انسانوں کے ان مرتب کردہ قوانین کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے؟ مودودی صاحب اپنے ان قوانین کے سلسلہ میں ایک انٹرویو میں کہا کہ اب مہارہ فریضہ یہ ہے کہ عوام الناس کو یہ احساس دلائیں کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے۔

(ترجمان القرآن - بابت اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱۳)

استغفر اللہ! ہمارا بار استغفر اللہ! انسانوں کے مرتب کردہ قوانین کو خدا کا قانون کہنا ایسا شرک ہی ہے جس کی جہارت ہم جیسے گنہگاروں کے لئے کھلی ہے۔ تصور میں بھی نہیں آسکتی! اس قسم کی جہالت تو آخر فقرے بھی نہیں کی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنی فقرہ کو ”قانون خداوندی“ کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ یہ ان کے اپنے مرتب کردہ قوانین ہیں۔ لہذا جو قوانین یہاں نافذ کئے جا رہے ہیں وہ حکومت پاکستان کے قوانین ہیں۔ قوانین خداوندی نہیں ہیں۔ تو خدا کی کتاب میں ہوتے ہیں (اور ہیں)۔ قرآن کریم نے اہل کتاب کے متعلق کہا تھا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ: یَلْبِسُونَ الذِّنَّ بِأَلْبَاسٍ یُفَوِّشُونَ عَنْهَا وَیُسْخَرُونَ مِنْهَا وَیُخْذَرُونَ مِنْهَا وَیُخْذَرُونَ مِنْهَا... (پڑ)۔ یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور انہیں قوانین خداوندی کہہ کر مشہور کرتے ہیں اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ کچھ مفاد حاصل کر لئے جائیں۔ سوچئے کہ کیا یہاں بھی بھینس یہی کچھ نہیں ہو رہا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ ان قوانین کے نقاد پر مودودی صاحب نے ایک بڑا اہم اعلان فرمایا تھا جو ان کی جہالت کے ترجمان ”ایشیا“ بابت گیارہ فروری ۱۹۶۹ء کے صفحہ نمبر ۱ پر شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے ان قوانین کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا تھا۔

انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور جہیز ہے اور خداوندی اور رسول کے دست انوں کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

سیکولر نظام حکومت میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے، لیکن ان کی خلاف ورزی سے صرف سزا جھگڑتی پڑتی ہے۔ اس سے نہ انسان کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے اور نہ ہی مہرم خدا کے غضب کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ کیفیت ہے کہ قوانین تو انسانوں کے وضع کردہ ہی نافذ کئے جاتے ہیں، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے نہ صرف سزا ہی ملتی ہے، بلکہ انسان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اس پر خدا کا غضب بھی ڈر رہتا ہے۔

اسے کہتے ہیں تھیا کر لسی جو انسانی غلامی کی شدید ترین اور بدترین شکل ہے اور جسے ختم کرنے کے لئے اقبالؒ اور قائد اعظمؒ نے مملکت پاکستان کو حاصل کیا تھا۔ انہوں نے بتا کر کہا تھا کہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، پاکستان میں تھیا کر لسی کو رائج نہیں ہونے دیا جائے گا جس میں مذہبی متضاد قوانین خداوندی

پیشوا اپنے قوانین کو تو انہیں خداوندی کہہ کر سوساتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ پاکستان میں فقہ حنفی کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں وہ فقہ خدا کا قانون ہے۔ ایران میں فقہ جعفریہ کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس لئے وہاں وہ فقہ خدا کا قانون ہے۔ یمنی مسلمانوں کی دو آزاد ملکوں میں دو ضوابط قوانین نافذ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن دودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق دونوں مسلمانوں خداوندی ہیں۔ سعودی عرب میں حنبلی فقہ (اسی اصول کے مطابق) خدا کا قانون ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے۔ کل کو اگر مصر، مراکش، انڈونیشیا وغیرہ نے بھی اپنے ہاں فقہی قوانین نافذ کر لئے تو بالکل درست نفعی فقیہیں بھی خدا کا قانون قرار پا جائیں گی جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ہے وہ اسلام جسے دنیا میں رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے !

پاکستان میں شیعہ حضرات فقہ جعفری کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تو یہاں دو فتواری حکومتیں قائم ہو جائیں گی جن کا اپنا اپنا ضابطہ قوانین ہو گا اور یہ دونوں "خدا کے قوانین" کہلائیں گے۔ اگر ان کا یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات فقہ حنفی کی خلافت درزی کریں گے۔ اس سے دھڑکتے ہوئے کہ وہ قانون کے مطابق سزا کے مستوجب ہوں گے بلکہ (دودودی صاحب کے فیصلہ کی روش سے) ان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا اور وہ مورد غضب خداوندی بھی ہوں گے۔ اور اگر شیعوں نے اکثریت حاصل کر لی تو پھر حنفیوں کا ایمان خطرہ میں پڑ جائے گا اور یہ مضروب علیہ ہو جائیں گے۔ اس سے آپ یہ بھی دیکھیں کہ اس طرح خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ یہ تصور کہ اس کی خوشنودی یا غضب کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ یہ لوگوں کی کثرت اور قلت پر منحصر ہے۔ آج ایک گروہ کو اکثریت حاصل ہے تو وہ منعم علیہ ہے۔ کل کو وہ اقلیت میں آگیا تو اس پر خدا کا غضب وار ہو گیا ! اس سے خدا کا تصور (معاذ اللہ - صمد ہار معاذ اللہ) پارلیمان کے سپیکر کا سا سامنے آتا ہے جسے ہر اکثریت کو برحق قرار دینا پڑتا ہے۔ آج یہ اکثریت میں کل وہ اکثریت میں۔ آج یہ حق پر کل وہ حق پر !

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں مذہب کے نقاب میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟ ہمارے نزدیک یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ یہ ایک سوچی سمجھی پیلے سے طے شدہ اسکیم کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی مملکت — خواہ وہ برطانیہ، امریکہ اور مچھارت کی نظام سرمایہ داری کی حامل ہو اور خواہ روس اور چین کی کمیونزم یا سوشلزم کی نمبر دار۔ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج ہو جائے۔ اس سے ان کے نظام تباہ ہو جائے ہیں۔ مطالبہ پاکستان کے زمانے میں اس کا بار بار اعلان کیا گیا تھا کہ ہم ایک آزاد مملکت کا قیام اس لئے چاہتے ہیں کہ اس میں قرآنی نظام رائج کیا جائے۔ یہ تمام ملکیتیں اس سے لڑتے براہ اندام تھیں اور اسی بنا پر وہ تقسیم ہند کی مخالفت کرتی تھیں۔ لارڈ کر ومر نے بہت پیسے کہہ دیا تھا کہ :-

اگر مسلمان ممالک آزاد ہونا چاہیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے۔ (حقیقتہً مارشیا - مومند ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء)

تھرکھو پاکستان کے دوران ہندوؤں کے مشہور رہنما مٹراشی نے ہر ملکہا تھا کہ :-

نہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ ہمیں معلوم نہیں لیجئے کہ پاکستان سے متعلق یہ ہے کہ مسلمانوں کو

اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں
طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ (۲ دسمبر ۱۹۴۷ء)

اور تو اور مشترک مذہبی ملک یہ کہہ رہے تھے کہ :-
اگر مذہب کو علی حادہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک بچے کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق
تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر مکمل آئیں گے جو مجبور کر دیں گے کہ یہ دونوں ایک
مشترک زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز مؤرخہ ۹ جون ۱۹۴۷ء)

قائم غلط فہمی کی ذرات پر ہندوؤں نے اندازہ لگایا تھا کہ اب پاکستان کی پوزیشن کمزور ہو گئی ہے اس لئے اس سے بھرتے
کی شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ اس بھرتے کے متعلق روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت کے مقالہ
افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ :-

اگر پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری سیاست کی تشکیل کرے
تھیں العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا
ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ ملکیت اسے برواشت ہی نہیں کر سکتیں تھیں کہ پاکستان قرآنی ملک بن جائے۔ جو جانتیں
مذہب کے نام پر تشکیل پاکستان کی مخالفت کر رہی تھیں وہ گزشتہ تیس سال سے پاکستان کے اندر رہتے ہوئے اس حد تک
میں مصروف چلی آ رہی ہیں کہ یہ مملکت قرآنی نہ بننے پائے۔ تشکیل پاکستان کے بعد جس تیزی، شدت، کثرت اور وسعت
سے "غیر اسلامی اسلام" اوقیں اس ملک اور ثانیا دیگر ممالک میں پھیلا گیا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ کیا آپ نے
کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کے بالآخر نتائج کیا ہیں؟ اب ان کی یہ کوششیں باہر آ رہی ہیں اور انہوں نے یہاں
تھیں کسی کو مسلط کرنا شروع کر دیا ہے یہ یاد رکھیے، سیکولرزم کے مقابلہ میں اسلامی نظام کا قیام اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا
تھیں کسی کے نظام میں مشکل ہوتا ہے۔ سیکولرزم میں خدا کا انکار ہوتا ہے اس لئے مسلمان اسے ٹھنڈے پیٹھوں پہل نہیں
کرتے۔ تھیں کسی میں اسی سیکولرزم کو خدا کا نام دے کر مسلط کیا جاتا ہے اس لئے عوام بہت جلد اس فریب میں آ جاتے
ہیں اور پھر اس جال سے چھٹکارا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ ہمارے مذہبی کی مثال تاریخ میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ ہم نے یہ ملکیت
حاصل کی تھی کہ ہم انسانوں کی غلامی سے نجات پا کر اور ایک خدا کی چوکھٹ پر سر جھکا کر ساری دنیا کے استافوں سے سرفراز
آگے بڑھ جائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ہم انسانی غلامی کی ان زنجیروں میں جکڑے گئے جن سے زیادہ حکم گرفت کسی زنجیر کی
نہیں ہو سکتی۔

خدا ستم پیکار برآرم، در جگر نشتر شکست

میں جانتا ہوں کہ یہاں مسلسل سازشوں سے ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ قرآن کریم کی آواز کسی کان تک
پہنچنے نہ پائے۔ میں اس کے باوجود یہ آواز بلند کرتے جا رہا ہوں۔ مفقود اس سے یہ ہے کہ کم از کم آنے والا مؤرخ اس
حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب پائے کہ ان تمام شوشوں اور سازشوں کے باوجود ایک گوشہ ایسا بھی تھا جہاں

سے یہ آواز مسلسل اور متواتر بلند ہو رہی تھی کہ :-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُفِيكَ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالشُّعْرَةَ لِتَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا
عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا
كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۱۶۷)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ وہ مفتی ہو، خواہ حکمران، حتیٰ کہ وہ منصب نبوت پر بھی مقرر ہو۔
یہ تو یہ کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے حکم اور نظام بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتاب اور وحی
کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اپنی فکر کا مرکز بناتے ہو فقط اللہ کے حکم بن جاؤ۔

اس کا نام حقیقی آزادی ہے جس سے ہم محروم ہی نہیں رہتے سے بھی کوسوں دور ہیں۔

ٹپک لے شیخ! انسانوں کے پروانے کی آنکھوں سے
سرایا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

یا

آخر میں سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ میں اس سوال کے جواب کو کسی خاص خطہ سرزمین تک محدود نہیں کہنا
چاہتا اس لئے کہ جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ پاکستان تک محدود نہیں۔ اس وقت مسلمانوں
کے تمام ممالک میں صورت حالات کم و بیش یہی ہے۔ اس لئے میں اپنے جواب میں یہ
کہوں گا کہ جو مملکت بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ ایک خدا کی حکومتی اختیار کر کے، انسانوں کی ہر قسم کی غلامی سے آزادی
حاصل کرے۔ خواہ اس حکومت کی شکل ملکیت ہو یا آمریت۔ تحقیق ایسی ہو یا عصر حاضر کا جمہوری نظام۔ اسے کرنا یہ ہوگا۔
۱۔ اپنے آئین میں اعلان کرے کہ مملکت میں اقتدار اعلیٰ قرآن مجید کو حاصل ہوگا۔

۲۔ مملکت کا ہر فیقہ قرآنی احکام و قوانین، اصول و اقدار کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

۳۔ یہ بات اہم (مملکت کے مسلمان باشندوں) کے باہمی مشوروں سے طے کی جائے گی کہ ان اصول و قوانین کو
بحالات موجود نافذ کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز کی جائے گی۔ اس مجلس مشاورت
کو آپ پارلیمان کہہ لیجئے۔ پارلیمان میں کوئی پارٹی نہیں ہوگی کہ قرآن کریم کی رو سے مذہبی فرقہ سادی یا پارٹی بازی
مشرک ہے۔ پارلیمان کی رکنیت کے لئے بنیادی شرط قرآنی احکام و اقدار سے واقفیت ہوگی۔

۴۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پارلیمان میں اس بات پر اختلاف ہو جائے کہ جو کچھ طے کیا جا رہا ہے وہ قرآنی
تعلیم کے مطابق ہے یا نہیں؟ یا عام افراد و محاشدہ میں یہ خیال پیدا ہو کہ پارلیمان جو فیصلہ کر رہی ہے وہ قرآن کے مطابق
نہیں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ ملک کی عدالت عالیہ کے ارکان، ممتاز قانون دان
حضرات اور قرآن کریم پر گہری نگاہ رکھنے والے ارباب علم و بصیرت پر مشتمل ایک مجلس قائم کی جائے جس کے سامنے
اختلافی امور پیش ہوں۔ اس مجلس کے اراکین اس شرط سے مشروط ہوں کہ وہ کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ قرآن مجید
اور آخری سند و حجت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ طے کریں کہ قرآن کریم کے حکم کو عملاً نافذ کرنے کے لئے جو طریقہ کار تجویز کیا
جا رہا ہے وہ ممکن العمل ہے اور قرآن کے کسی اصول سے ٹکراتا نہیں۔